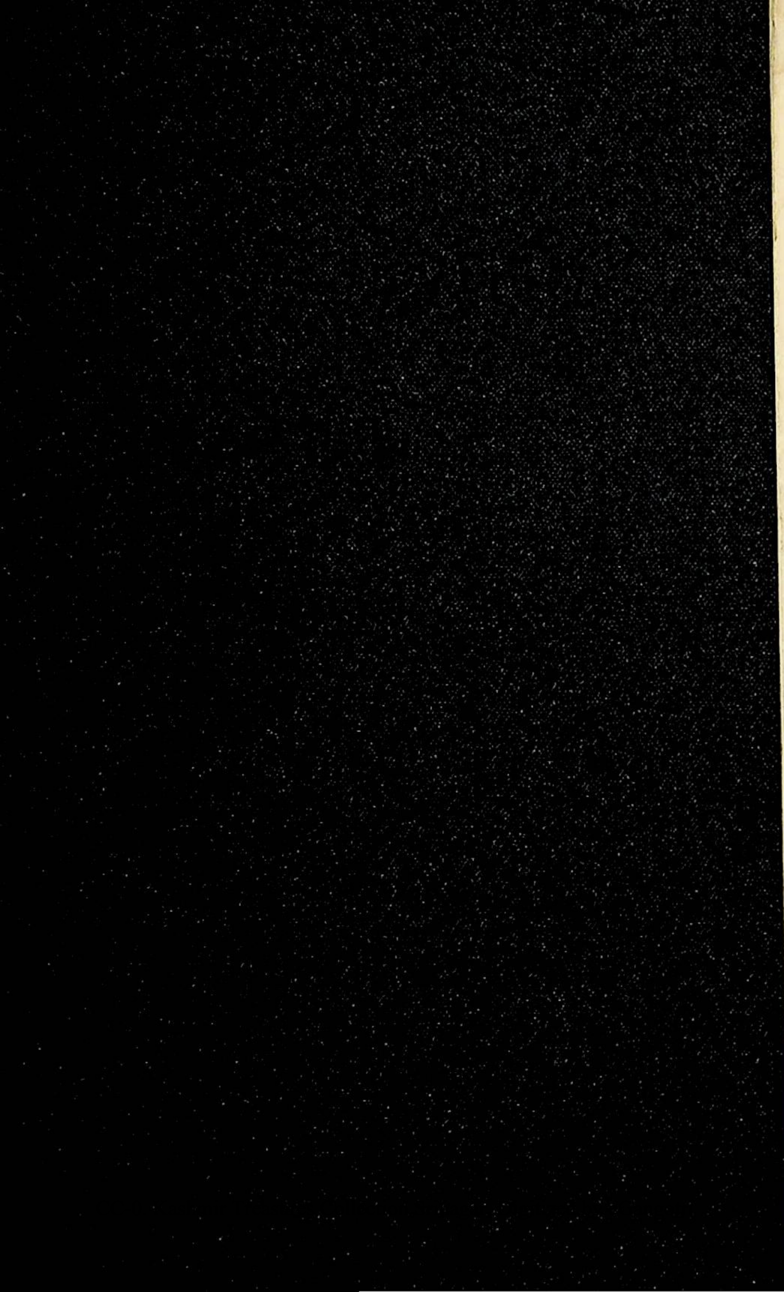
اردو قصیدہ
ایک مطالعہ

ساحل احمد



اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد





اردو قصیدہ۔ ایک مطالعہ

ساحل احمد

اردو رائٹرس گلڈ۔ الہ آباد

ڈاکٹر سید اعجاز حسین اور ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کی یاد میں

کتاب : اردو قصیدہ ایک مطالعہ

مصنّف : ساحل احمد

اشاعت : ۱۹۹۸

طباعت : تاج آفسٹ۔ الہ آباد

کتابت : ذکی احسن

قیمت : ۱۰/-

ناشر : اردو رائٹرس گلڈ۔ الہ آباد

رابطہ : لٹریری بک سنٹر ۱۲۶ چک الہ آباد ۔ ۲۱۱۰۰۳

دو باتیں

لٹل بک سیریز کے تحت ان
ان کتابوں کی اشاعت کا مقصد طلبا ء
و طالبات کی درسی ضرورتوں کو پورا کرنا
اور ارزاں قیمت میں مہیّا کرانا اور محدود
صفحات میں نفیس موضوع سمیٹ دینا۔

اس مدعا کو ملحوظ رکھتے ہوئے
قصیدہ کی فنّی حیثیت، مقبولیت، لوازم
ترقی اور امکانات پر بحث کی گئی ہے۔

اس سلسلے کے تحت اسی طور کی
مزید کتابیں تیاری کے مراحل میں ہیں۔

نظم، افسانہ، ڈرامہ، ناول،
رباعی اور تنقید کے موضوع پر بہت
جلد کتابیں طبع ہو جانے کی توقع ہے۔
انتظار کیجیے اور گلڈ کے اشاعتی سلسلے میں
تعاون کیجیے۔

فہرست کتب طلب کر کے حلقۂ
احباب تک گلڈ کی مطبوعات کا تعارف
کرائیے۔ رابطہ رکھیے۔

ساحل احمد

الہ آباد ۱۰ر جولائی ۱۹۹۸

اردو قصیدہ۔ ایک مطالعہ

(۱)

اردو کی ترقی اور نشو و نما میں بھاشا کے ساتھ فارسی ادبیات کا جو قیمتی حصّہ شامل ہے اس کی ثمرباری کا ثبوت بعض وہ اصناف ہیں جو راست طور پر فارسی سے اردو میں آئیں۔ ان میں قصیدہ کو اولیت حاصل ہے جو ہیئت اور موضوع کے اشتراک و عمل کی عمدہ مثال ہے۔ فارسی زبان نے ہندی زمین پر اپنی زبان اردو کی آبیاری کی اور فکر و خیال، عروض و قواعد اور زبان و بیان کی تراشیدگی میں حصّہ لیا۔ چوں کہ اردو کا لسانی رشتہ سنسکرت بھاشا، اردو فارسی سے ہی ثابت ہے اسی لیے اردو اور فارسی کے مابین ادبی رشتہ برخلافِ عربی کے زیادہ توانا اور مضبوط ہے۔

(قصیدہ لفظ قصد سے مشتق ہے۔ قصد یا قصیدہ کا لغوی معنی مغز ہے۔ اصطلاحاً یہ وہ صنف شعر ہے جس میں شعر اول کے دونوں مصرعے اور بعد کے باقی اشعار کے آخری مصرعے ہم قافیہ ہوں) بعض علمائ کا خیال

خیال ہے کہ قصیدہ اسی لفظ معتبر قصد سے وارد ہوا ہے جس کے معنی ارادہ کرنے کے ہیں۔ اس کا مادّہ قصد ہے اور مصدر القصد، اس کے ارادہ کرنے یا ارادہ کروانے کے دونوں جذبے، مرضی یا غیر مرضی دونوں رویّوں کا دخیل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ کیوں کہ اکثر بعض حاکموں یا بادشاہوں نے بہ جبر اپنی شانِ کبریت یعنی گندھکی مزاج و اعمال کے زعم و نخوت کے زور پر قصیدہ لکھوایا ہے یا لکھوانا چاہا ہے۔ قصیدہ آورد کا ہی نتیجہ ہے۔ آمد سے اس کا کوئی صریح تعلق نہیں۔ آمد سے بر آمد قصیدہ میں راستی کا حُسن موجود ہوتا ہے۔ جب کہ آورد سے بر آمد قصائد میں غلو حاوی ہو جاتا ہے۔ جس شاعر میں جتنی قوت متخیلہ موجود ہوگی وہ اس فن قصیدہ کا سردار قرار پائے گا۔ اکثر اس دور جدید یا دور قدیم میں بھی بعض حاکمین یا وزرا یا چھوٹے موٹے مقامی نیتا اپنی شانِ رشد یہ یا کنشیہ کے لیے بعض زر خرید شعرا سے قصیدیہ نظمیں لکھوائی ہیں۔ اس ذیل میں عربی زبان کا مشہور قصیدہ نگار کا شمار ہے۔ جنہوں نے لفظ قصید کی پاکی و راستی کو اپنی سیہ روشنی سے گندہ کر نے کی کوشش کی ہے۔ آتش نے اسی بلا طواری فکر کے خلاف کہا ہے۔

زبان کھلنے کا نقش منہ بھرائی ہے
دہانِ غنچہ کو رکھتا ہے مُشتِ زر خاموش

جاہ و مرتبہ اور حاکمیت کے لیے حرص و ہوس اور لالچ نے راستی کو ذبح کرنے میں بھی جھجک یا شرم محسوس نہیں کی۔ اسی شان کبریت کے اثرات دیکھنا ہو تو ہر سال ہزار ہا کتابیں شائع ہو رہی ہیں لیکن گھروں

ہیں ۔٪۱۰ اسے قطع نظر بیشتر گھروں میں نظر نہیں آتیں۔ جب ادب کو ذریعۂ انعام و صلہ بنالیا جائے تو اس کا یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ گھروں سے اردو زبان غائب ہوتی جاتی ہے۔ بیشتر جن کا ذریعہ معاش اردو ہے۔ ان کے گھروں میں اردو کی اکا دکا کتابیں ہی نظر آتی ہیں۔ گھر کے بجٹ اخراجات میں اردو کے لیے بھی تھوڑی سی رقم تفویض کرنی چاہیئے۔ یہ بھی اسی قصدیہ فکر کا کرشمہ ہے۔ جس طرح نااہلی یا کم فہمی نے بے شری. بے مائگی اور ناقدری کی تخم ریزی کی ہے اسے دانستہ یا نادانستہ حروف قرآن کو بے حرمت کرنے کا ہی نام دیا جاسکتا ہے۔ ڈھول بجانے ڈھنڈورا پیٹنے دھوم دھڑاکا کرنے سے اردو کے چاند کو جبا مت نہیں مل سکتی ہے۔ قصیدہ جیسی پاک صنف کو اسی نوع کے لوگوں نے اپنے مفاد کی خاطر استعمال کیا۔ جھوٹ. مبالغہ۔ خوشامد۔ حرص۔ ہوس طمع جیسی بدترخصلت کا اضافہ اسی بدیہ سرشت کا نتیجہ ہے۔ حالیہ صورت یہ ہے کہ گاؤں سے قصبات تک اور قصبات سے شہر تک قصیدہ کو اینٹ پتھروں میں ڈھال کر چوراہوں پر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ذی علم اشخاص کو بے حرمت کرنے کا یہ بھی ایک نیا طریقہ ہے۔ جس طرح ماضی میں طاقت و حاکمیت کے زور پر قصیدے لکھوائے گئے۔ وہی ذہنیت مختلف شکلوں میں آج بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔ مقتدر شخصیتوں کو کوڑے کرکٹ میں ڈال دیا گیا ہے۔ ان مفاد پرستوں کا بس ہوتا تو تعلیمی نصاب میں دخیل ہوکر علمی شخصیتوں کو خارج از نصاب کر ڈالتے۔

قرآن مجید میں "قصد" کو "قصد السبیل" استعمال کیا ہے۔ جس کے معنی راستے کا تعین ہے۔ قصیدہ شروع سے ہی پاکی خیال اور راستی کا ذریعہ ہے۔

اور جب تک یہ نیکو کاروں اور اللہ کے نیک بندوں کے پاس رہا اس کی پاکی اور راستی زندہ رہی۔ جنہوں نے اس کے توسط سے اصلاح معاشرہ اور قومی و ملکی فلاح و بہبود کا بھی کام کیا۔

سوداؔ۔ ولیؔ۔ نصرتیؔ۔ محسنؔ اور اسمٰعیل میرٹھی وغیرہ کے اسمائے مبارک شامل ہیں۔

قصید کو ارادہ۔ بھروسہ۔ کرد۔ کُن کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہی نہیں اس کی وسعت کی کوئی حد متعین نہیں کی جا سکتی۔ اس صنف سے رشتہ اس شاعر سے قائم ہو سکتا ہے جس کا عاقل و فہیم ہونا تو لازم ہی ہے۔ ساتھ ساتھ اس کا صابر و شاکر ہونا بھی لازم ہے۔

قصیدہ کے معنی و مقاصد کے ضمن میں عربی و فارسی علماء سے قطع نظر اردو کے ادیبوں میں حالیؔ۔ شبلیؔ۔ جلال الدین جعفریؔ۔ ضیاء احمد بدایونی امداد امام اثرؔ۔ مسعود حسن رضوی وغیرہ نے عالمانہ تحریریں آئندہ کی نسلوں تک پہنچائیں ہیں۔

قصیدہ پر دقیع اور وسیع المعنی صنف سخن ہے۔ بلاغت فکر۔ شوکت بیان اور پر شکوہ مضمون یہ تمام اصناف سخن میں پُر جلال حیثیت کی مالک ہے۔ بادشاہ و امراء کے زیر سایہ اس صنف کو بے پناہ ترقی حاصل ہوئی۔ لیکن ہوا یہ کہ بعض نا اہل۔ بے رتبہ فاسق و فاجر مزاج کے حامل شعراء نے اسے ذریعۂ معاش قرار دے لیا۔ اور پھر یہیں سے کذب و جھوٹ کا دریا بہہ نکلا اور یہ دریا بہتے بہتے اس صدی کی آخری سرحد کو چھونے لگا۔ اسی دریا کے تیراکوں نے دھما چوکڑی مچا رکھی ہے مگرمچھ گھڑیال۔ لہو عاشق

مچھلیوں کے مساوی یہ کم علم۔ جہل شکار۔ کینہ توز۔ یہ رو۔ راست گوئی کی راہ کا روڑا بن گئے ہیں۔ انہیں کے اعمال نا قصہ نے اردو کے چہرے کو داغ دار کیا ہے۔ کرسیوں پر اکڑی گردن۔ چلیں تو اکڑی گردن۔ تخت و اسٹیج پر اکڑی گردن۔ کذب و جھوٹ کی جتنی شکلیں ان قصیدوں کی یاد دلاتی ہیں جن میں جھوٹ۔ مبالغہ۔ طمع۔ نخوت۔ خوشامد۔ کیا موجود نہیں۔

(۲)

قصد سے مشتق اس لفظ کیا قصد و ارادے کا جو دخل ہوتا ہے۔ اُسے ذہین اور عاقل شاعر تخلیقیت کے برش سے سنوار دیتا ہے۔ ہیئتی اعتبار سے یہ غزل یا مثنوی کے مشابہ ہے۔ عموماً ردیف کے استعمال سے گریز کیا گیا ہے۔ ردیفیہ قصائد نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کا پہلا شعر مطلع ہوتا ہے۔ بعد کے اشعار مطلع سے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ ایک جزو یا بند کے بعد یا کچھ وقفہ کے بعد (حسب ضرورت) دوسرا مطلع یا اور مطلع کہے جا سکتے ہیں جن کو مطلع ثانی، مطلع ثالث یا مطلع چہارم وغیرہ کے نام سے منسوب کیا جا سکتا ہے لیکن دو مطلع ایک ساتھ شامل نہیں کیے جا سکتے ہیں۔ یہ حق صرف غزل کو حاصل ہے۔" اکثر تازہ مطلع سے قصیدہ میں ایک نیا لطف اور زور پیدا ہو جاتا ہے۔ دو مطلعوں کے قصیدوں کو ذو مطلعین اور دو سے زیادہ مطلعوں کے قصیدے کو ذو المطالع کہتے ہیں۔" [۵]

---

۵ ہفت قلزم جلد ہفتم ص ۵

شعر کی تعداد متعین نہیں کی گئی۔ تعداد شعر شاعر کی افتاد طبع اور قادر الکلامی پر منحصر ہے۔ نظم کی طرح قصیدے میں افکار و خیالات کی ہم آہنگی اور ربط و ضبط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اشعار کی تعداد کے ضمن میں کئی متضاد رائے درج تحریر ہوئیں۔ عربوں کے نزدیک تعداد کم از کم ۳ یا ۱۶ ہونی چاہیئے۔ "کسی نے سات ۷، کسی نے بارہ ۱۲، کسی نے پندرہ ۱۵، کسی نے بیس ۲۰ کسی نے اکیس ۲۱، کسی نے پچیس ۲۵ بتائی ہے لیکن بعض اہل قلم نے ان کی تعداد سو ۱۰۰، ایک سو بیس ۱۲۰ اور ایک سو ستر ۱۷۰ لکھی ہے۔" ص[۱] یہ تعداد کوئی معیّنہ تعداد نہیں اور نہ قصیدہ کے اصول کے مطابق ہے۔ نصرتی کا ایک قصیدہ ۲۲۰۔ اشعار پر اور قدر بلگرامی کا "آئینۂ محبوب" ۲۳۔ شعروں پر، شاطر مدراسی کا "اعجاز عشق" ۱۳۹۶۔ اشعار پر اور میاں اصلح الدین کا ایک قصیدہ ۸۰۰ سے زائد اشعار پر مشتمل ہے۔

نظم کی طرح قصیدے میں افکار و خیالات کے لحاظ سے ہر قصیدہ کا کوئی نہ کوئی عنوان ضرور ہوتا ہے مثلاً

در مدح آصف جاہ نظام الملک :

فجر ہوتے جو گئی آج میری آنکھ جھپک — ۱۱۸ شعر، سودا

در مدح منقبت حضرت علی :

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل — ۲۰۱ شعر، سودا

ص[۱] بہ حوالہ ڈاکٹر ابو محمد سحر۔ اردو میں قصیدہ نگاری ص ۱۳

در مدح شاہ زادہ سلیمان شکوہ:

صبح دم میں نے جو لی بسترِ گُل پر کروٹ — ۱۰۷ شعر، انشاء

در مدح بہادر شاہ ظفر:

ساون میں دیا پھر مہِ شوّال دکھائی — ۴۴ شعر، ذوق

در مدح راجہ رنجیت سنگھ:

صبح ہوئی تو کیا ہوا؟ ہے وہی تیرہ اختری — ۱۰۵ شعر، مومن

در منقبت حضرت علی:

دہر، جُز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں — ۳۳ شعر، مرزا غالب

در مدح خیر المسلمین:

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل — ۴۲ شعر، محسن

در مدح کلب علی خاں:

تختِ کاغذ پہ ہوا صدر نشیں شاہ قلم — ۱۲۴ شعر، مینائی

در مدحِ شاہ غازی بیجاپور علی عادل شاہ:

اے شہ! تو، ہم نام علی، شاہاں پو، تیری سروری — ۲۷ شعر، نصرتی

اسی طرح قصیدے کے آخری حرف کی مناسبت سے قصیدہ کا نام دیا جاتا ہے۔ جیسے قصیدۂ لامیہ، قصیدۂ میمیہ، قصیدۂ کافیہ، قصیدۂ رائیہ، قصیدۂ نونیہ، اور قصیدۂ یائیہ وغیرہ

لاتا نیرنگ سے ہے رنگ نئے چرخِ محیل (لامیہ۔ ذوق)

بگھیاں نور کی تیار کرائے یوسمن (نونیہ۔ انشاء)

ہے جب کفر ثابت، ہے وہ تمغائے مسلمانی (یائیہ۔ سودا)

بتاؤں کیا تجھے ہم دم میں کب سے ہوں دلگیر (رائیہ۔ تسنیم)

فجر ہوتے ہو گئی آج مری آنکھ جھپک (کافیہ۔ سودا)

(۳)

موضوعی اعتبار سے قصیدہ کا دامن بے حد وسیع ہے۔ اس میں مدح و ستائش اور ہجو و ذم کے علاوہ مناظر فطرت، پند و نصائح، مذہب و قلم، معاشی و معاشرتی حالات، بے ثباتیٔ دنیا، عبد و ریاضت، انسانی رشتے، شاعرانہ تعلّی، سیاست و انقلاب، موسمی کیفیات، عشقیہ واردات اور علوم مختلفہ کا ذکر بہ تفصیل کیا گیا ہے۔ شہر آشوب کو بھی قصیدہ کا ہی جزو مانا گیا ہے۔ دامان قصیدہ میں وہ سب کچھ ہے جو ادب کے تقاضے ہیں۔ کلیمؔ دہلوی کا ایک قصیدہ بہ نام "روضۃ الشعراء" شعرائے عصر کے حالات پر مشتمل ہے۔ اصلح الدین کا قصیدہ برش شمشیر "تنقیدی زاویے کو اجاگر کرتا ہے۔ اور دور جدید میں شہدائے کربلا و آئمہ کے سلسلے سے لکھی جانے والی نظم مقاصدہ کے نام سے موسوم کی گئی ہے اور اکثر شعراء نے قصائد کو عنوان یا نام دینے کا بھی التزام کیا ہے۔ مثلاً باب الجنت، بحر بیکراں، رزمیۂ بہار، فریاد، زندانی، مطلع انوار،

در نجف، شمع حرم، جریدۂ عبرت، جشن نوروز، مناظر شانہ و آئینہ، قصیدۂ چرخیہ وغیرہ۔

(الف) موضوعی اعتبار سے درج ذیل قسمیں وضع کی گئی ہیں۔

(i) مدحیہ (ii) ہجویہ (iii) وعظیہ (iv) بیانیہ (v) حالیہ

(vi) بہاریہ (vii) فخریہ (viii) دعائیہ (ix) رزمیہ (x) علمیہ

(ب) ظاہری شکل و خصائص اور نوعیت کی بنا پر قصیدہ کی دو قسمیں کی گئی ہیں۔

(i) تمہیدیہ (ii) خطابیہ

(الف)

(i) مدحیہ :- وہ قصیدہ جس میں کسی ممدوح کی صرف تعریف و توصیف ہی بیان کی گئی ہو۔ اردو قصیدوں میں اس قسم کے قصائد کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ شجاع الدین کی مدح میں سودا کا اور بہادر شاہ ظفر کی مدح میں غالب کا کہا گیا قصیدہ بہت معروف ہیں۔

تو وہ عادل جہاں میں، نہ قلم رو میں ترے
چونٹی دست تعدی سے نہ ہووے پامال (سودا)

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن .. نام شاہنشہ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ مظہر ذوالجلال والاکرام
(غالب)

(ii) ہجویہ :- وہ قصیدہ جس میں کسی شخص کی ایسی وہ تمام

برائیاں بیان کی گئی ہوں جو اس کی کنجوسی، بدصورتی، بدخیالی، بزدلی، بدکرداری، بے حیائی اور ریاکاری وغیرہ کو ظاہر کریں۔ اس کے علاوہ زمانے کی مشکلات اور دشواریوں کا ذکر بہ طور شکایت نظم کیا جائے۔ اس سلسلے میں میر جعفر زٹلی کا "دستور العمل در اختلاف زمانہ ناہنجار"۔ مرزا سودا کا "در ویرانی شاہ جہان آباد" اور میر جعفر علی حسرت کا "در احوال جہان آباد" اس کی مثال ہیں۔

ہے میری ڈیوڑھی کے ناظر کو تیر افاقہ   جو محلدار ہے اس نے دیا ہے استعفا
مچایا ترکنی، کشمیرنی نے اب غوغا   رہے بچارے سلاطین، ان کا حال ہو کیا
کسی کے مرنے کی نوبت کوئی پڑا ہے نڈھال

(میر جعفر علی حسرت)

(۱۶) وعظیہ :- وہ قصائد جن میں اخلاق و اقدار اور سماجی برائیوں کے خلاف اصلاحی موضوع نظم کیا گیا ہو اور پند و نصیحت کی گئی ہو۔ سودا کا قصیدہ "نصائح فن شعر" کا ایک شعر

سخن ایسا نہ سرزد ہو کہ دل اس کا ہو دو نیم
گو ہوئے تیغ زباں کا تری جوہر اشعار

(۱۷) بیانیہ :- وہ قصیدہ جن میں عصری حالات و افکارات کی عکاسی کی گئی ہو۔ یہ قصائد شہر آشوب کے ہی مماثل قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

کوئی سر بہ کیے خاک، گریباں کسو کا چاک
کوئی رو دھے ہے سر پیٹ کوئی ہے نالہ کناں   (سودا)

(۷) حالیہ :۔ جب قصیدہ کی تشبیب میں شاعر اپنے ذاتی حالات و کوائف کا بیان بہ شکل شکوہ و شکایت کرتا ہے۔ اس قصیدہ کو "قصیدۂ حالیہ" کہا گیا ہے اور شاعر عموماً اپنا حال دل پذیر بیان کرنے کی سعی کرتا ہے۔ ذوق کے یہ اشعار مثالاً پیش کیے جا سکتے ہیں۔

لاتا نیرنگ سے ہے رنگ نئے چرخ محیل
واہ بگڑا ہے کچھ اس نظم میں کیا عجب رنگ سے نیل

ڈر زمانے سے وہ عیار ہے یہ ہوش ربا
لاکھ بے ہوشیوں سے جس کی بھری ہے زنبیل

---

(۷۱) بہاریہ :۔ جس قصیدے کی تشبیب بہاریہ اسباب و علل کا احاطہ کرتی ہے ایسے قصیدہ کو بہاریہ قصیدہ کہتے ہیں۔ ذوق اور سودا کے قصیدے کے اشعار حسب ذیل ہیں۔

آب جو گردِ چمن لمعۂ خورشید سے ہے
خط گلزار کے صفحہ پہ طلائی جدول

لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم
پاؤں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل

(سودا)

آرائش گلشن کے لیے جامۂ رنگیں زیبائش غنچہ کے لیے تنگ قبائی
ہے نرگس شہلا نے دیا آنکھ میں کاجل برگ گل سوسن نے دھڑی لب پہ جمائی

ہوتی متحمل نہیں اک ساغرِ گُل کی شاخِ گُلِ احمر کی نزاکت سے کلائی

(ذوق)

(VII) فخریہ :- اگر شاعر نے باب تشبیب میں اپنی سخن وری، علم دانی فروتنی، مہارت، فکری و ذہنی ہنرمندی، علمی تونگری، بہادری، شنادری حکمت وعدل، حکمت و سروری کا ذکر فخر و ناز سے کرتا ہے تو ایسے قصائد کو فخریہ قصیدہ کہے جانے کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً ذوقؔ نے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں رواں قصیدہ کے درمیان حصّہ تشبیب میں اپنی علم دانی اور سخن سنجی کی تعریف کی ہے۔

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت
نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت
ہو گیا علم حصولی تھا حضوری مجھ کو
تھا مرا ذہن نہ محتاج حصولِ صورت
جو مسائل نظری تھے وہ بدیہی تھے تمام
عقل کو تجربہ کی آتی ہوئی تھی کثرت
کبھی منطق کو تفوق یہ مرے ناطقے سے
تحتِ حکمت ہو یہ فن گرچہ ہے تحتِ حکمت
کبھی میں کرتا تھا تفریع و معانی و بیاں
کبھی میں کرتا تھا توضیح نجوم و ہیئت

(VIII) دعائیہ :- ہیئتی نقطۂ نظر سے قصیدہ کی ایک قسم دعائیہ

قصیدہ بھی ہے جس میں تشبیب نہیں ہوتی۔ اس قصیدہ میں خطابیہ قصیدہ کے برخلاف بغیر کسی تمہید کے دعا سے ہی بیان شروع کر دیا جاتا ہے۔ دعا کے بعد مدح کے شعر کہے جاتے ہیں اس ضمن میں سودا کا قصیدہ در مدح عالمگیر ثانی کو مثالاً پیش کیا جا سکتا ہے۔

رکھے ہمیشہ تیری تیغ، کارِ کفر تباہ
بہ حق اشہد ان لا الٰہ الا اللہ

---

(۱۷) رزمیہ :۔ وہ قصیدہ جو رزم اور رزم گاہ کا تذکرہ جوش و خروش کے ساتھ کیا جائے۔ جنگ اور لوازمات جنگ کا ذکر تمام جزوی حقیقتوں کے ساتھ کیا جائے۔

توپیں جو داغتے تھے فتیلوں سے آن آن
انجک فتال برق چمکتی تھی بار بار
گنجال مثل رعد کے کڑکے تھے دم بدم
آوازِ شترنال تھی طاؤس کی جھنکار

(سودا)

---

(۱۸) علمیہ :۔ وہ قصیدہ جو تشبیب سے دعا و عرض تک علمی اصطلاحات سے آراستہ ہو اور علوم مختلفہ کے تعلق سے شاعر کی علم دانی اور علمیہ فکر سے واقفیت بہم ہوتی ہوئی معلوم ہو۔ شاعر کی عالمانہ حیثیت متعیّن ہوتی ہو۔

واہ وا کیا معتدل ہے باغِ عالم کی ہوا
مثلِ نبضِ صاحبِ محبت ہے ہر موجِ صبا
ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہمِ زخمِ جگر
شاخِ بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا
پائی یہ اصلاح صفرا نے کہ دنیا میں کہیں
زرد چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہربا
ہر مزاج بلغمی میں ہوتی ہے تولیدِ خوں
چاندنی کا پھول ہو گر اے غوانی ہے بجا

(ذوقؔ

(ب) (۱) تمہیدیہ :۔ وہ قصیدہ ہے جس میں ممدوح کی سیرت وصورت اور اوصاف مختلفہ عہدہ و رتبہ، علم و بصارت وغیرہ کا ذکر توصیفی یا تعریفی انداز میں کیا جاتا ہے لیکن ان کلمات کی ادائیگی سے قبل بہ طور تشبیب اور گریز اور بعدہٗ مدح و دعا کے عناصر خصوصی ہیں جن پر قصیدہ کی عالی شان، معتبر عمارت تعمیر کی جاتی ہے۔ ظاہری خصلتوں کی بناپر خطابیہ اور تمہیدیہ قصائد کی تقسیم عمل میں لائی گئی ہے۔ لیکن موضوعی سطح پر تمہیدیہ قصیدہ کے چار اجزا تسلیم کیے گئے ہیں جن کو اجزائے ترکیبی یا عناصر ترکیبی کہتے ہیں۔

۱۔ تشبیب ۲۔ گریز ۳۔ مدح ۴۔ دعا

(۱) تشبیب :۔ قصیدے کے ابتدائی اشعار کو تشبیب کہتے ہیں جو کہ لفظ شباب سے مشتق ہے جسے نسیب بھی کہا گیا ہے جس کے معنی حسن نسوانی کا ذکر۔

روایت کے مطابق عربی شعراء تشبیب کے باب میں عشقیہ موضوع کو نظم کیا کرتے تھے۔
مگر اردو اور فارسی شعراء نے تشبیب کو محض عشقیہ موضوع تک محدود نہیں رکھا۔
اس میں اور بھی بہت سی وسعت پیدا کی گئی ہے تشبیب کا پہلا شعر مطلع ہوتا ہے
اور یہ مطلع فکر و موضوع کا وہ پہلا چہرہ ہے جس سے تشبیب کے خدوخال کی رونمائی
کا عمل پورا ہوتا ہے۔ تشبیب معنی آگ بھڑکانے کے مترادف ہے یعنی تشبیب
جتنی مضبوط، موقر، عمدہ اور خوبصورت ہوگی آگے کی منزلیں اسی قدر جامعیت
کی حامل ہوں گی۔ اس باب میں بے ثباتی' دنیا' پند و نصائح' حکمت و نجوم'
منطق و فلسفہ' تصوف و اخلاق' موسم بہار' شعر و موسیقی کے مباحث رندی و
سرمستی کی کیفیات' امید و یقین' جوش و ولولہ اور قدر و تہذیب کے متعلقہ مسائل
کو موضوع بنایا گیا ہے۔

دراصل تشبیب ہی قصیدے کی بنیادی اینٹ ہے۔ اسی سے قصیدے
کی معنویت' ارضیت اور افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔

جس طرح غزل گو شعراء مطلع کے ذریعہ سامعین کی توجہ اپنی طرف مبذول
کرتا ہے اسی طرح قصیدہ گو اس چہرہ کے ذریعہ ممدوح کی توجہ اپنی طرف
مبذول کر کے ایسی فضا تیار کرتا ہے کہ ممدوح اس کے عرض مدعا پر مخلصانہ
یا ہمدردانہ غور کر سکے۔ ممدوح کے منصب و مرتبہ کا بطور خاص لحاظ رکھنا
لازم ہے۔ اس کے اشعار کی تعداد مدح کے اشعار سے زیادہ ہو تو بہتر ہے۔
کیوں کہ تشبیب ہی وہ حصہ ہے جس سے شاعر کی قادر الکلامی' حکمت اور علمی تونگری
ظاہر ہوتی ہے۔ جب کہ ابن رشیق نے اس تعیّن تعداد کو معائب میں شمار کیا ہے۔

اس کے نزدیک تشبیب کے اشعار کی تعداد مدح کے اشعار سے زیادہ ہونا مناسب نہیں۔ ڈاکٹر محمد ابو سحر نے لکھا ہے کہ

"قصیدے کا اصل موضوع مدحت طرازی تھا۔ تشبیب کے مضامین ضمنی حیثیت رکھتے تھے۔ مدّاح اور ممدوح کے تعلق اور حصول صلہ و انعام میں خاطر خواہ کامیابی کے لیے یہ ایک نفسیاتی تقاضہ تھا کہ قصیدے میں مدحیہ اشعار پر زیادہ زور دیا جائے۔ اور ان کی تعداد دیگر اشعار سے زیادہ ہو۔ بزرگانِ دین کی مدح بھی مذہبی جوش، عقیدت مندی اور حصول ثواب کی خواہش پر مبنی تھی۔" ۱

بعض مواقع پر ان تمہیدی اشعار سے شاعر کی خود ستائی کا پہلو اجاگر ہو سکتا ہے۔ اسی سے ممکنہ حد تک مزاج کو ممدوح کے منصب و مرتبہ کا لحاظ رکھنا لازم ہے۔ البتہ دوسرے مواقع پر جب تشبیب بہاریہ یا حکمت و فلسفہ سے متعلق ہو اشعار کی تعداد بڑھ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں مثلاً سودا کا "در مدح نواب عماد الملک آصف جاہ"

سلسلۂ تشبیب کے کچھ منتخب اشعار ملاحظہ ہوں۔

فجر ہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک
دی وہیں آ کے خوشی نے درِ دل پر دستک

---

۱ اردو میں قصیدہ نگاری ص ۲۱

پوچھا میں، کون ہے؟ بولی کہ میں وہ ہوں غافل
نہ لگے شوق میں جس کے کبھو شائق کی پلک

ہے خوشی نام مرا، میں ہوں عزیز دنیا
زندگی کی حلاوت ہے جہاں میں مجھ تک

کھول آغوشِ دل اور لے مجھے جلدی ناداں
پھر خدا جانے یہ دن کب تجھے دکھلائے فلک

(سودا) در مدح نواب عماد الملک آصف جاہ

واہ واہ کیا معتدل ہے باغِ عالم کی ہوا
مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا

بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار
بن گیا گلزارِ عالم رشکِ صد دار الشفاء

(ذوق) در مدح بہادر شاہ

۳۔ گریز:۔ قصیدے کے دوسرے جزو کو گریز کہتے ہیں۔ جس کے لغوی معنی "بھاگنا" ہے۔ چوں کہ یہ اشعار ممدوح تک پہنچنے کا وسیلہ بھی ہیں جس کے لیے کوئی بہانہ یا موقعہ تلاشنا شاعر کی مجبوری ہے۔ اس مجبوری کو شاعرانہ سے بھی نسبت دی جا سکتی ہے۔ دراصل یہ تشبیب اور مدح کے درمیان کی وہ منطقی و معنوی کڑی ہے جو ان دونوں کے درمیان ربط و ضبط اور انسلاک کی فضا ہموار کر سکے۔ گو کہ یہ حصہ بہت مختصر ہوتا ہے مگر شاعرانہ تدبر کے باعث

بہت پر اثر اور پُر قوت ہو سکتا ہے۔ یہ ایک ایسے سلسلے کی نازک منزل ہے جسے انتہائی نظم و ضبط کے ساتھ پہلے اور تیسرے جزوؤں سے منسلک کیا جاتا ہے۔ اصطلاحاً عربی قول کے مطابق گریز دو سرکش بیلوں کو ایک جوئے میں جوتنے کے مترادف ہے۔ یہ وہ نازک مقام ہے جہاں سے شاعر یا مدّاح کا مدعائے خیال مطمع نظر میں تبدیل ہوتا ہے۔ وہ سابقہ سلسلے کو انتہائی خوبصورتی یا ہنرمندی کے ساتھ لاحقے کی منزل تک لے جانے کا وسیلہ قرار پاتا ہے۔ ایک سلسلۂ خیال کو دوسرے سلسلۂ خیال تک منتقل کرنے کا عمل، عمل شعریہ سے منسوب ہے۔

واقعی کس طرح سے صحت نہ اک عالم کو ہو
جبکہ ہو اس کی نوید غسلِ صحت جاں فزا

ذوق

آج اس شخص کی ہے سال گرہ کی شادی
کہ بصورت ہے وہ انسان و بہ سیرت ہے ملک

سودا

(iii) مدح یا ہجو :۔ گریز کے بعد کی منزل مدح کہلاتی ہے مدحیہ حصّے کے پسِ پشت وہ مدعا و مقصد پنہاں ہوتا ہے جسے اشاروں میں ظاہر کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ اور شاعرانہ خیال کے خوب خوب جوہر فشانی کی جاتی ہے لیکن مدح میں حفظ و مراتب کا خیال بہ طور خاص رکھنا چاہیئے اور یہ پہلو خاصہ نازک اور پُر تکلف ہوتا ہے اسی لیے جو طریقۂ اظہار اختیار کیا جائے وہ ممدوح کے شایان شان ہو۔ مدح میں بالعموم ممدوح کے جاہ و جلال، دولت و امارت،

دبدبہ، قناعت، راست گوئی، خلق و مروت، فیوض و برکات، علم و اخلاق، فرائضِ منصبی، حمیت و خودداری، حدودِ سلطنت، حاکمیت، بہادری، جنگ جوئی، شمشیر زنی، شکار گاہی خصلت، رحم دلی، خدا ترسی، عفّت و پاک دامنی، حسن و جمال، قدو قامت، علمی تونگری وغیرہ وغیرہ کی تعریف کی جاتی ہے لیکن یہ حصّہ بہت احتیاط طلب ہے۔ عموماً شاعر دامنِ احتیاط چھوڑ دیتا ہے "غلو" کا تابع ہو جاتا ہے۔ مبالغہ بہر پروبال پالیتا ہے۔ غلو سر سبز ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً اخلاق و راستی کو صدمہ پہنچتا ہے۔ قصیدے کے اسی کمزور پہلو کے باعث حرص و آز کے تابعین اسے ذریعۂ معاش بنالیا۔ یوں شاعری نے ترقی کی۔ جھوٹے طمع باز شاعر کی کثرت اسی منفی فکر کا نتیجہ ہے۔ حالی نے اسی منفی رویّہ کے سلسلے میں بہت درست باتیں لکھی ہیں۔

> "قصیدہ کا مصداق نفس الامر میں کوئی انسان قرار نہیں پا سکتا۔ ممدوح کی ذات میں جو واقعی خوبیاں ہوتی ہیں اس سے اصلاً تعرض نہیں کیا جاتا بلکہ بجائے ان کے ایسی محال باتیں بیان کی جاتی ہیں جن کے اضداد اس کی ذات میں موجود ہیں۔ مثلاً ایک جاہل کو علم و فضل کے ساتھ، ایک ظالم کو عدل و انصاف کے ساتھ، ایک احمق اور غافل کو دانش مندی اور بیدار مغزی کے ساتھ، ایک عاجز و بے دست و پا کو قدرت و مکنت کے ساتھ، ایک ایسے شخص کو جس کی ران نے کبھی گھوڑے کی پیٹھ کو مس نہیں کیا شہسواری اور

فردیت کے ساتھ غرض کہ کوئی بات ایسی نہیں بیان کی جاتی جس پر ممدوح فخر کر سکے۔ یا جس سے لوگوں کے دل میں اس کی عظمت اور محبت پیدا ہو اور اس کے محاسن و مآثر زمانہ میں یادگار رہیں۔"

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ	مظہر ذوالجلال والاکرام
شہسوار طریقۂ انصاف	نوبہار حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورت اعجاز	جس کا ہر قول معنیِ الہام
بزم میں میزبان قیصر و جم	رزم میں اوستادِ رستم و سام

—— غالب۔ در مدح بہادر شاہ

(۱۷) دعا: یہ قصیدہ کا آخری جزو ہے۔ جہاں شاعر اپنا نجی حال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ممدوح کی صحت اور دولت و امارت منصب و رتبہ اور اجلال و جمال کی دعا کرتا ہے۔

رکھے صحت سے ہمیشہ شافیٔ مطلق تجھے
جو ترے بدخواہ ہوں وہ رنج میں ہوں مبتلا

—— ذوق

(۱۱) خطابیہ: اس نوع کے قصائد میں تشبیب و گریز کو قطع کرتے ہوئے راست بیان کو ہی اوّلیت دے دی جاتی ہے۔ سوداؔ کا قصیدہ "در مدح عالم گیر ثانی" کو مثالاً پیش کیا جاسکتا ہے۔

ہے اشتہار تجھ سے مرا ائے فلک جناب — رخشندگیٔ ذرّہ ہے از فیضِ آفتاب
ذوق۔

اردو کی تمام اصناف سخن کے ابتدائی نمونے دکن سے ہی دستیاب ہوئے۔ یہ بہمنی سلطنت زمانہ قصیدے کے آثار و اعلام متفرق رسالہ جات کی صورت میں دستیاب تو ہیں لیکن پہلا قصیدہ گو کسے قرار دیا جائے یہ ابھی تک طے نہیں ہو پایا۔ نصر الدین ہاشمی نے آذری کو پہلا قصیدہ گو کہا ہے اسی کے ساتھ دو اور نام مشتاق اور لطیفی کے بھی لیے جا سکتے ہیں۔ مگر مصدقہ طور پر ابھی تک کوئی بات طے نہیں ہو پائی۔ مشتاق اور لطیفی کے جو نمونۂ قصائد ملتے ہیں وہ ٹھیٹھ دکنی زبان میں ہیں۔

فتنہ شجاعت کا دیکھ رستم دستا چھپا
شور سخاوت کا سن ہو گیا حاتم اصم
مشتاق

—

صبح ہوا یا صفا رین کا کجلا کوا
چھوڑ چمن کی ہوا غیب ہوا ما زغن
لطفی

—

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد پانچ خود مختار حکومتیں (قطب شاہی (گولکنڈہ)، عادل شاہی (بیجاپور)، نظام شاہی (احمد نگر)، عماد شاہی (برار)، اور برید شاہی (بیدر) قائم ہوئیں جن میں اوّل الذکر دو ریاستوں نے اردو کی ترقی میں نمایاں حصّہ لیا۔

گولکنڈہ کا سلطان محمد قلی قطب شاہ جو شاعر اور شاعر نواز تھا اس دور کے قصیدہ گویوں میں محمد قطب شاہ عبد اللہ، قطبی، غواصی، عادل شاہی شعراء میں خود علی عادل شاہ، مقیمی، رستمی، ملک خوش نود، نصرتی، ہاشمی وغیرہ کے قصائد معنوی اعتبار سے قیمتی ہیں۔

اورنگ زیب ۱۰۹۷ھ میں بیجاپور اور ۱۰۹۸ میں گولکنڈہ پر قابض ہوا تو اورنگ آباد کو مرکزیت حاصل ہوئی۔ قاضی محمود بحری اس عہد کا نمائندہ شاعر ہے۔ گجرات کا امین ایک ایسا ہی شاعر ہے جس نے ایک نعتیہ قصیدہ لکھا۔ مختصر یہ کہ دکن کے قصیدہ نگاروں میں قلی، عادل، غواصی، نصرتی، وجہی، اور ولی کو اہمیت حاصل ہے۔

کلیات قلی میں چھ نامکمل اور چھ مکمل قصائد ہیں۔ نعت و منقبت کے علاوہ عید، عید قربان، نوروز اور بسنت کے موضوعات پر موثر قصائد تخلیق کیے۔ ان قصیدوں کی زبان ٹھیٹھ دکنی ہے۔ فارسی، فارسی لفظیات اور ہند ایرانی علائم موجود ہیں۔

بسنت کا پھول کھلیا ہے سو جیوں یاقوت ربانی
کرو مل کر سہیلیاں سب بسنت کے تائیں مہمانی

— بسنت

مبارک ہن ترے مکھ ترے نور سورج تھے ہوا پیدا
فراجاں لے کے آئے ہیں شہاں ہم عید و ہم نوروز

— نوروز

غواصی، عبداللہ قطب شاہ کا درباری شاعر تھا۔ اس کے قلمی نسخے میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے مطابق ۳۵ قصائد ہیں لیکن محمد بن عمر کے مرتبہ کلیات میں ۲۱ قصیدے شامل ہیں۔ ان کے مطبوعہ قصائد میں ایک قصیدہ ۵۶۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ باقی نہ طویل اور نہ بہت مختصر بعض قصائد میں ردیف کا بھی التزام کیا گیا ہے۔ اور مشکل زمینوں میں قصیدے کہے ہیں۔ ایک قصیدے میں انہوں نے ذو قافیتین کا بھی التزام کیا ہے۔ ان کے تقریباً سبھی قصیدے عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ زبان بہت مشکل لیکن استعمالی بحریں شگفتہ ہیں۔ تشبیب میں زیادہ تر حمد و نعت اور منقبت کا اہتمام کیا ہے۔ اور پند و نصائح کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔

تحت الثرا تھے تا بہ ثریا رواج دے
قدرت ہر ایک چیز میں اپنی عیاں کیا

اگر کچھ عشق ہے تج میں تو سر دیوانگی کوں دے
برہنہ بے سر و پا پھر سر و دستار نیں تو نیں

شاہی کے قصائد حمد و منقبت پر مبنی ہیں۔ اس کے کلیات میں چھ قصیدے ہیں جن میں دو حضرت علی کی شان میں ہیں اور ایک "علی داد محل" کی تعریف میں اور ایک سولہ رکنی بحر میں عشقیہ قصیدہ "چار در چار" کے عنوان سے شامل ہے۔ ان آخرالذکر قصیدوں کو چھوڑ کر باقی قصیدوں میں اجزائے قصیدہ کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

قصیدوں میں شعریت اور غنائیت باہم پیوست ہیں۔ ان کے قصائد کے بعض حصے
میں غنائی رنگ گہرا یا ہوا ہے۔ ان کا کوئی قصیدہ ۶۵ شعر سے زیادہ کا نہیں
ہے۔ مگر ان استعمالی اجزاء کے اصول و مقاصد کو ملحوظ نظر رکھا گیا ہے۔ قافیوں
کے استعمال میں گرفت گہری ہے۔ ایک قصیدے کی تشبیب میں "عقل و عشق"
کے اوصاف بیان کیے ہیں۔

عقل کا موتی مگر مغز کے طبلے بہتر
خوب دستا وے جھلک در جک در عدن
لب کے کواڑیاں لگا پلک کا پردہ بندھا
سیس نین کا چھجا عقل کا یو ہے وطن

—

بنفشہ یاس کے دعوے عروسی لے کے نت بیٹھی
نزاکت دیکھتے اس کی نین نرگس کُھلایا ہے
پنکھی خوش مغز ہوشیارے اپس میں اب لگے گانے
میوُراں ناچتے ٹھارڑے بدل بردنگ بجایا ہے

—— بہاریہ / عاشقانہ تشبیب

شاہ نجف ولی ہے تس نانوں سو علی ہے
وہ رازداں احمد سلطان اولیا کا

—— شان علی

ملک الشعراء نصرتی عادل شاہ ثانی کا درباری شاعر تھا۔ ایک قصیدہ علی عادل شاہ کی مدح میں ایک معراج کے ضمن میں مشہور ہیں اور ایک قصیدہ چرخیہ" تشبیہی اور استعارتی اسلوب کا حامل قصیدہ ہے۔ ۱۲۳ اشعار پر مشتمل یہ قصیدہ نصرتی کا شاہ کار ہے انہوں نے عادل شاہ کے قصیدے میں رزمیہ عناصر کا استعمال بہت عمدگی سے کیا ہے۔ خصوصاً گھوڑے، تلوار اور ہاتھی کی تقریب میں جو اشعار کہے ہیں وہ مثالی ہیں۔ علی نامہ میں شامل ان کا پہلا قصیدہ فتح پتالہ کے بیان میں ہے۔ علی نامہ کے اکثر قصائد کی ابتداء بادشاہ کی مدح سے ہوئی ہے۔ البتہ عاشورہ کے بیان میں جو قصیدہ ہے اس میں بہ طور تمہید حمد، نعت اور منقبت کے مضامین نظم کیے۔

کہتا ہوں اول حمد میں عالم کے سرجن ہار کا
افلاک کا اونچا چھپّا باندھا ہے کس بستار کا

—

علی عادل شہ غازی شہنشہ بوالمظفر کوں
دیا ہے جس خدا ایسا کہ تھا جیسے سکندر کوں

—

ولی دکنی کے کلیات میں چھ قصائد شامل ہیں۔ ان سب کی نوعیت مذہبی ہے۔ ان میں اخلاق و تصوف، علم نجوم اور موسیقی کے لوازمات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ایک قصیدہ خطابیہ اور باقی تمہیدیہ۔

حُسنِ بتاں کے دور میں سحر ایک شام دو

نہ سگے شوق میں جس کے، کبھو شائق کی پلک

(۱۱۸)

چمن میں موجِ تبسّم کی کھول کر زنجیر

اگر عدم سے نہ ہو ساتھ فکر روزی کا

آیا عمل میں تیغ سے تیرے وہ کارزار

سودا کے کلیات میں ۳۸ مدحیہ اور ۴۴ ہجویہ قصائد شامل ہیں انہوں نے رسول خدا، حضرت فاطمہ بی بی، حضرت علی اور دیگر آئمہ کی تعریف میں عمرِ عزیز کو بندگی سکھلائی۔ دینوی اعتبار سے کئی حکمرانوں اور خیر خواہوں کی مدح کی۔

سودا کے بعد ذوق ہی وہ شخصیت ہے جس نے فن قصیدہ گوئی میں سودا سے ہار نہیں مانی۔ اور اپنی جوہر کلامی کی نایاب مثالیں پیش کر دی ہیں "نظم اردو کی نقاشی میں مرزائے موصوف (یعنی سودا) کے قصیدے پر دست کاری کا حق ادا کر دیا۔ ان کے بعد شیخ مرحوم کے سوا کسی نے اس پر قلم نہیں اٹھایا اور انہوں نے مرقع کو ایسی اونچی محراب پہ سجایا جہاں

کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا...... انہوں نے اپنی کڑک دمک سے ہند کی زمین کو آسمان کر دکھایا" ص۱

اس میں شک نہیں ذوق نے اپنی طبع علم و حکمت سے قصیدہ کو قصیدہ کی طرح استعمال کیا۔ ان کے بیشتر قصیدے اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں۔ صرف ایک قصیدہ سید عاشق نہال چشتی کی مدح میں کہا گیا ہے لیکن افسوس انہوں نے خلفائے دین کی شان و بزرگی میں کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ ان کے دیوان میں ۲۴ مکمّل اور ۳ نامکمّل قصیدے شامل ہیں۔ سب سے طویل قصیدہ "شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت" ہے۔ جو بہادر شاہ ظفر کی مدح میں کہا گیا ہے۔ اس میں ۱۷۰ شعر ہیں۔ سید عاشق نہال چشتی کی مدح میں کہا گیا قصیدہ ۱۳۵ اشعروں پر مشتمل ہے۔ مجموعی طور پر ان سب قصائد میں ان کی علمی ذکاوت، فکری دروبستگی، زبان دانی استعارہ سازی کیا کچھ نہیں ہے۔ کون سا ایسا قصیدہ ہے جس میں انہوں نے نئی سی نئی گُل پاشی نہ کی ہو۔ انہوں نے سادہ و آسان بحوریں منتخب کیں۔ گنجیدہ و مشکل موضوعات کو صفت سیالہ سے متصف کر دیا ہے مگر بعض سنگلاخ زمینوں کو بھی دست ہنر سے ایسا تراشا ہے کہ لفظوں کا تاج محل تعمیر کر دیا۔ ان کی دو آتشائی فکر کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ہیں مری آنکھوں میں اشکوں کے تماشا گوہر
اک گہر دیکھوں تو ہوں، کتنے ہی پیدا گوہر

ص۱ محمد حسین آزاد۔ آب حیات صفحہ ۱۷۴

میر کے قصائد کسی خاص خوبی کے حامل نہیں۔ بیان کا وہی مروّجہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو پیش تر سے رائج الوقت تھا۔ مشکل الفاظ و تراکیب سے قصیدہ کے تطابق کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مبالغہ اور قوت متخیلہ کے ذریعہ کلام کی اجلالی کیفیت میں اضافہ کیا گیا ہے۔ زمینیں وہی ہیں جو سودا کی ہیں۔ مدح میں رزم و بزم دونوں کی شراکت کا خیال رکھا ہے۔ جنگی آلات و محاذ، تیر، تلوار، ہاتھی، گھوڑا وغیرہ کا ذکر آصف الدولہ اور شاہ عالم کے قصائد میں موجود ہے۔ ان کی بعض بہاریہ تشبیب کی تعریف کی جا سکتی ہے۔ کچھ مطلعے ملاحظہ ہوں۔

رات میں مطلق نہ تھی یاں جی کو تاب
آشنا ہوتا نہ تھا، آنکھوں سے خواب

جہاں میں کون ہے جس کو کسی سے الفت ہے
خراب کوچہ و بازار یاں محبت ہے

میر حسن کے قصائد میں وہ گرمی قصر نہیں جو قصیدہ کی طینت و اجلال کو مطلوب ہے۔ البتہ غزلیہ نرمی اور شائی انداز جذب و کشش کا باعث بن گئے ہیں۔

سیاہی خط کی نہیں ہے یہ مصحف رو پر
خدا نے سورۂ والشمس کی لکھی تفسیر

در مدح نواب سالار جنگ

کون انگڑائیاں لیتا ہے چمن میں مخمور
غنچہ بھر بھر کے گلابی کرے ہے کیوں تقسیم

ـــــ میر حسن ۔ در مدح آصف الدولہ

انشا کے کلیات میں دس قصیدے ملتے ہیں جن میں چار حمد و منقبت میں اور باقی امراؤ سلاطین کی تعریف میں ہیں۔ ان قصیدوں کی زمینیں سخت اور سنگلاخ ہیں۔ عربی و فارسی کے ادق الفاظ، علمی اصطلاحات اور غیر مستعمل تلمیحات کے استعمال سے شعری صلابت کمزور ہوئی ہے۔ یہی نہیں بعض ایسی صنعتیں استعمال کی ہیں جن سے شعریت کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ البتہ ان کی علمی ذکاوت اور شخصی طرحداری تعارف کا ذریعہ بنی ہے۔

نوع بشر میں تھے نہاں آتش و باد، آب و خاک
عشق نے کر دیئے عیاں آتش و باد، آب و خاک

ـــــ در مدح حضرت دوازدہ امام

برش وش میرے گناہوں پہ جو مارے چشمک
ہوئے گردن زدنی لائقِ شلاقِ آتش

ـــــ

در منقبت حضرت علی

صبح دم میں نے جو لی بستر گل پر کروٹ
جنبش بادِ بہاری سے گئی آنکھ اچٹ
دیکھتا کیا ہوں سرہانے ہے کھڑی ایک پری
جس کے جوبن سے ٹپکتی ہے نری گدراہٹ

——— در مدح جارج ثالث

مصحفی، ذوق و سودا کے بعد تیسرے پر گو قصیدہ گو ہیں۔ ان کے قصیدوں کی تعداد نوے کے آس پاس ہے جس میں ۱۷ قصیدے نعت و منقبت میں ہیں۔ زمینیں مشکل ضرور ہیں مگر انشا جیسی بے اعتدالیاں نہیں۔ متانت اور اور ذکاوت موجود ہے۔

یہ جوشِ نامیہ اب کے ہوا ہے فصلِ بہار
کہ دانہ ہوا ہے ہر، مرغ کے تہِ منقار

——— در مدح سلیمان شکوہ

قائم چاند پوری، رنگین، ممنون، میر ضیا، جعفر علی حسرت۔ مظہر علی خان ولا، حیدری وغیرہ نے بھی قصائد لکھے ہیں۔ مگر یہ قصیدے اس بلندیٔ خیال تک پہنچ سکے جہاں ان کے پیش رووں کی آفتابی شعاع روشن و تابندہ تھی۔

انشاؔ، مصحفیؔ اور رنگینؔ کی قصیدہ گوئی کے مابین لکھنؤ میں قصیدہ گوئی کو نئی زندگی ملی۔ کچھ تو دلّی کی معاشی و سیاسی ابتری نے تہذیبی و ثقافتی دائرے کو محدود کیا۔ کچھ یار غاروں اور عزیز و اقربا کی معاندانہ روش نے بعضوں کو دربدری پر مجبور کر دیا۔ نتیجتاً میرؔ، انشاؔ، مصحفیؔ، رنگینؔ اور نسیمؔ وغیرہ جیسے ذی قدر شخصیتوں کو پورب کی سمت مراجعت کرنی پڑی۔ اور وادئ ہجرت کا سفر کیا۔ لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ میں قدرے ہوائیں ساکن تھیں، نرم تھیں۔ امیرؔ، قلقؔ، سحرؔ اور شہیدیؔ کے کارہائے قصیدہ کی اپنی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس وقت افتراق و اختلال کے بعد اوائل بیسویں صدی سے قصیدے کو ترقی کے نئے مواقع ملے اور وطنیت کی چاہ پیدا ہوتی۔ اچھے موسم، دھوپ، ہوا، پانی کی دعائیں کیں۔ اشخاص ہی قصیدے کا محور نہیں رہے۔ اشیائے وطن بھی قصیدہ کا حصہ بنیں اور اس کے خد و خال میں نئی آب و آب چمک نظر آنے لگی۔ امیرؔ مینائی منیرؔ شکوہ آبادی، جلالؔ لکھنوی، تسلیمؔ، داغؔ، محسنؔ، قدرؔ بلگرامی اور ظہیرؔ دہلوی پر ہی یہ سلسلہ نہیں رک جاتا، جاری رہتا ہے۔

نسیمؔ، قلقؔ، اسیرؔ، سحرؔ اور شہیدیؔ کے قصائد میں وہ منتہائے جلال موجود نہیں جو قصیدہ کا حسن یا مطالبہ ہے۔ ان سب کے یہاں مجموعی حیثیت سے رعایت لفظی اور مبالغہ کی فکری جہت موجود ہے اور اکثر حالتوں میں مقامیت اور ہندوستانی ماحول کی تصاویر دکھائی دیتی ہیں۔ قصیدہ کا وہ طمطراق لب و لہجہ نہیں اس میں نرمی و حلیمی اور وطنیت کی آنچ ضرور موجود ہے۔

موسمِ گل ہے مناسب ہے گلستاں میں مقام
رنگ پر آئے ہیں غنچوں کے سبو پھولوں کے جام

ــــ آسیر۔ در مدح کلب علی خاں

بڑھاتے ہیں اسے بے فائدہ خوشامد گر
کہاں اسیر میں اس درجہ دانش و فرہنگ

ــــ آسیر۔ در منقبت امام رضا

گھرا ہوا ہے جو ابرِ بہار صورت شام
جبینِ شاخ پہ گل کے کنول ہوئے روشن

ــــ نسیم۔ در مدح شرف الدولہ

بارشِ سیم نے کی وقت سخا دھوپ سفید
چاند کا ہوتا ہے خورشید کے چہرے پہ گماں

ــــ نسیم۔ در مدح واجد علی شاہ

یہ جوشِ گل ہے چمن میں جگہ نہیں ملتی
سنبھل سنبھل کے قدم رکھتی ہے نسیم بہار

ــــ خلق۔ در مدح واجد علی شاہ

اے ہوا جا کے بنارس سے اُڑا لا بادل
چاہیئے ہندوی سوسن کے لیے گنگا جل
اثرِ بادِ بہاری سے بنے ابرِ بہار
مینہ برستے میں اگر اوڑھ کے نکلو کمبل
— سحر۔ قصیدہ درصفتِ بہار

دبستانِ ازل میں وہ معلم کل کا تھا
نہ تھا نام ونشاں جن روزوں اس لوحِ زبرجد کا
— شہیدی۔ قصیدہ درنعت

امیر مینائی کے مطبوعہ دیوان میں بارہ قصائد دستیاب ہیں۔ بزرگانِ دین کے سلسلے میں ۵ قصیدے اور باقی عمائدین سلطنت کے متعلق ہیں۔ تشبیب عموماً بہاریہ لکھی ہے۔ سراپا اور منظر نگاری عمدہ کی ہے تشبیہات و استعارات کے استعمال میں ہنرمندی دکھائی دیتی ہے۔

ہر طرف گل ہائے رنگا رنگ گلشن میں کھلے
جیسے صبح عید یکجا ہوں حسینانِ جہاں

—

کس قدر دریا تری دریا دلی کا ہے وسیع
مثل نیلوفر نظر آتا ہے جس میں آسماں

منیر شکوہ آبادی کے کلیات میں ۲۸ قصیدے امرا و رؤسا کی شان میں ہیں۔ اور کچھ نعت و منقبت میں بھی شامل ہیں۔ بعض قصیدوں کی تشبیب بہاریہ شکل ہیں۔ قصیدے سودا کی پیروی میں لکھے ہیں۔ جن میں متانت سنجیدگی اور علمی اصطلاحات موجود ہیں۔ ان کی زیادہ تر تشبیب بہاریہ ہے۔

پرتو مہر ہو ہو شمع شبستانِ حمل
غازۂ صبح بنے تشقۂ ہندوئے زحل

جلال نے زیادہ قصائد بزرگان دین کی مدح میں لکھے ہیں۔ ان کے قصیدہ میں وہ تمام شعری لوازمات موجود ہیں جن سے قصیدہ کی جلالی کیفیت ترقی پاتی ہے۔ ان کے مطبوعہ قصائد پر ذوق و سودا کا گہرا اثر ہے۔

ظہور آج ہے اس نور کا زمانے میں
قدم سے جس کے ہوا فرش خاک عرش نشیں

تسلیم کے بھی زیادہ تر قصائد ارباب دولت کی مداحی میں کہے گئے ہیں۔ کسی فنی وابستگی کی علامت نظر نہیں آتی۔ عموماً ان کے قصائد

تقلیدی ہیں۔ قدر و ظہیر کے قصائد بھی کسی نئی روش کا اظہار نہیں۔

وہ سیہ بخت ہوں دریا میں اگر سایہ پڑے

بے گماں قلب صدف میں ہو ہویدا گوہر

تسلیم

حسب دستور داغ نے بھی کچھ قصیدے نواب رام پور نظام حیدر آباد کی مدح میں رسمیہ طور پر لکھے ہیں۔ قصائد سنگلاخ زمینوں میں کہے گئے قصیدوں میں صناعی اور متانت موجود ہے۔ مثلاً

سمندر میں سمندر ہوں صدف میں ہوں شرر پیدا

جو چمکے آتشِ قہر و غضب کی تیرے چنگاری

ان ہم عصروں میں محسن کاکوروی کی اہمیت قدرے زیادہ ہے انہوں نے پانچ نعتیہ قصیدے لکھے ہیں۔ جن کے عنوان تاریخی ہیں۔ گلدستہ کلام رحمت (۱۲۵۸ھ) ابیات نعت (۱۲۷۴ھ) مدیح خیر المرسلین (۱۲۹۳ھ) نظم دل افروز (۱۳۱۸ھ) اور انیس آخرت (۱۳۲۲ھ) یادگاری تحفے ہیں۔ "سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل" ان کا بہت مشہور و معروف قصیدہ ہے۔

اس قصیدے سے ان کی جذباتی شدت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے تشبیب بہاریہ ہے لیکن ہندیانی مزاج، ہندی تلمیحات اور رسم و

روایات کے نظام روابط سے جو فضا تشکیل کی ہے وہ ہماری تہذیبی روایات کا ہی حصّہ ہے۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
جو گیا بھیس کیے چہرخ لگائے ہے بھبھوت
یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھانے کنبل

ظہیر دہلوی کے وہ قصاید جو انہوں نے ملکہ وکٹوریہ نظام دکن، والئ ٹونک اور نواب شاہ جہاں بیگم بھوپال کے لیے تخلیق کیے۔ مراتبیات کے ضمن میں جو اسلوب اختیار کیا وہ عالمانہ ہے۔

نورِ باطن ترا گنجینۂ رمزِ مخفی   دلِ روشن ترا آئینۂ اسرارِ نہاں
تیری تحقیق نظر پردہ کشائے اوہام   تیری تصدیق بیاں چہرہ نمائے ایقاں

حالی کے قصاید میں نئے رنگ و آہنگ کے مساوی امتزاج نے ایک ایسے سادہ اسلوب کی بازیافت کی جو پہلے کم یاب تھی۔

ان کے دیوان میں سات مکمل اور تین نامکمل قصیدے شامل ہیں۔ دو نعتیہ اور باقی نواب سرآسماں جاہ، ملکہ وکٹوریہ اور نظام دکن کی تعریف میں ہیں۔ اسی لیے ان قصاید پر مدح کا اطلاق مناسب ہے۔

رعیت شاد، ملک آباد اور آزاد ہر ملت
ادا حق کر دیا شاہِ دکن نے حکمرانی کا

ـــــــ

ہر اک ملت ہر اک مذہب سے ہے یکساں سلوک اس کا
کوئی گر سیکھ لے اس سے جہاں کی پاسبانی کا
در مدح نظام دکن

اسمٰعیل میرٹھی نے شخصی مدح سے گریز کیا اور حالات عصر کو قصید کا موضوع بناتے ہوئے حقیقت و افادیت پر زور دیا۔ "تخیل کے بجائے محاکات سے کام لیا۔"

بدلتے تقاضوں کے مدِ نظر ایک ایسا رائیہ قصیدہ لکھا جس میں ضحیکِ روزگار کے کئی پہلو موجود ہیں۔

سوائے عشق نہیں سوجھتا انہیں مضمون
سو وہ بھی محض خیالی گھڑت کا اک طومار
کریں جو مدح کسی خیرہ کٹے کی وہ بالفرض
تو پھر سکندر و دارا ہیں اس کے باج گزار

ـــــــ

نظم طباطبائی نے حقیقت نگاری کی روش اختیار کی۔ اسلامی

تاریخ، شخصیات اور رسول کریمؐ کی حیاتِ اقدس کو موضوع بنایا۔
اور ان جنگوں کو یاد کیا جن سے امید و یقین اور حوصلے وابستہ ہیں۔
غزوۂ حنین میں کہتے ہیں۔

پتھر بندھا ہوا تھا شکم پر دمِ جہاد
لیکن قدم گڑے ہوئے تھے کوہسار میں

یہ بھی خبر نہیں کہ ورم کر گئے ہیں پاؤں
اور محو ہیں عبادتِ پروردگار میں

عزیز لکھنوی کے مجموعۂ کلام "صحیفۂ ولا" میں ۵۰ سے
زاید قصاید شامل ہیں۔ بہت پُر گو قصیدہ نگار ہیں۔ بیش تر قصاید
اسلام اور تاریخ اسلام سے متعلق ہیں۔ زبان بلیغ اور بیان
محاکاتی ہے۔

مجھے اس بحرِ عشقِ سرمدی کا ایک قطرہ دے
کہ جس نے انبیاء کے چشمۂ دل میں جگہ پائی

—— قصیدہ" سرجوش غدیر" سے

محشر کی قصیدہ گوئی میں جدّت ادا اور معنوی اصالت کا ارتباط
مستحسن ہے

اس طرح اس عہد کے دوسرے قصیدہ گویوں کے یہاں مذہبی

عنصر حاوی ہے۔ جب کہ ان ہم عصروں میں ایک منفرد قصیدہ گو محمد عبدالرحمٰن شاکر مدراسی ہیں۔ "اعجازِ عشق" ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔ پھر اضافے کے بعد اشعار کی تعداد ۱۴۰۰ کے قریب پہنچ گئی۔ علمی تفکر اور اعجاز بیانی کے باعث ان قصاید کی حیثیت مثالی ہوگئی ہے۔

بے محل اٹھتا نہیں ہے ایک بھی تیرا قدم ۔۔۔ کوئی ہے مجھ پر سوار اے ابلقِ لیل و نہار

بدھ کہیں، نادر کہیں حاتم کہیں، قارون کہیں ۔۔۔ کیا کرشمے ہیں ودیعت تجھ میں اے مشتِ غبار

علت و معلول کا کیا خاک اندازہ کریں ۔۔۔ امر واحد کے ہیں اسباب و نتائج بے شمار

ترقی پسند تحریک نے قصیدے کی نوعیت میں تبدیلی پیدا کی اور قصیدہ کا نیا روپ غازۂ آزادی سے رنگین ہوا۔ جمیل مظہری اور سردار جعفری وغیرہ کی بعض نظمیں قصاید کے ہی مماثل ہیں۔ مگر ان کی نوعیت قصیدہ کی نہیں۔ مگر آج مجالس میں پڑھے جانے والے بعض قصیدے مذہبی ہوتے ہوئے بھی ادبی معیار کے حامل ہیں۔